(غلام گردش)

گھنے درخت

لائل پور کی جیل روڈ کے دونوں طرف بڑے مضبوط اور گھنے درخت تھے۔لگتا تھا جیسے شہر کی حفاظت کر رہے ہیں۔مستعد چوکیداروں اور سپاہیوں کی مانند۔جن افراد نے 1963 کا لائل پور (فیصل آباد) دیکھ رکھا ہو، وہ واقعی آج کی عمارتوں اور بے پناہ آبادی کے جنگل کو پہچان نہیں پاتے۔ ہمارے تمام شہر، قصبے، گاؤں اور دیہات آبادی کے سیلاب میں گم ہو چکے ہیں۔ایک بڑھتی ہوئی آتش فشاں آبادی۔مگر یہاں کس کو فکر ہے۔آج کل تو ہم تمام ملکر جمہوریت بچا رہے ہیں۔ایک ایسی جمہوریت جسکا نام ونشان تھا ہی نہیں اور ہوگا بھی نہیں۔سب ملکر ایک ایسے مفروضہ کو بچانے کی کوشش کر رہے ہیں، جو کبھی وجود ہی نہیں رکھتی تھی۔لائل پور کی بات ہو رہی تھی۔ جناح کالونی سے ڈویژنل پبلک سکول تک کی سڑک تقریباً سیدھی سی تھی۔سڑک پر جیسے ہی زرعی یونیورسٹی کی حدود شروع ہوتی تھیں، درختوں کی تعداد ایک دم بڑھ جاتی تھی۔ادارہ کے اندر لگے ہوئے درخت بھی دیواروں سے اوپر نکل کر باہر والوں کو سایہ دینے میں مصروف نظر آتے تھے۔ بے لوث اور وفادار سا کام۔بغیر کسی معاوضہ کے۔

جس شخص نے لائل پور میں ڈویژنل پبلک سکول بنانے کا فیصلہ کیا، مجھے اسکے نام کا علم نہیں۔شائد جاننا بھی نہیں چاہتا۔اسکی عمارت دیکھ کر حیرت سے مونہہ کھلے کا کھلا رہ جاتا تھا۔اتنی شاندار بلڈنگ۔وسیع دروسیع کھیلنے والے گراؤنڈ اور نفیس ہوسٹل۔ہاتھ اُٹھا کر ان محسن لوگوں کیلئے دعا کرتا ہوں، جنہوں نے شہر کو اچھے سکول جیسا عظیم تحفہ دیا۔اسے احسان کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔1964-65 کا ادارہ ایک نایاب جگہ تھی۔جونیئر سیکشن سے سینئر سیکشن آنے کا تجربہ بھی حیرت انگیز تھا۔جونیئر سکول شائد چوتھی یا پانچویں تک تھا۔پرنسپل، چودھری اصغر کمال کے منتظم تھے۔کیمرج یونیورسٹی سے فارغ التحصیل شخص جو ہر وقت طالبعلموں کے ساتھ رابطے میں رہتا تھا۔کالا گاؤن پہنے ہوئے اس عظیم شخص کو صرف ایک جنون تھا۔ادارہ کے بچے بہتر انسان بنیں۔کہتا تھا، کہ لندن میں ایک فقرہ مشہور ہے "طالبعلم کے صرف چلنے اور اُٹھنے بیٹھنے کے طریقے سے اسکی درسگاہ کا نام پتہ چل جاتا ہے"۔شائد آپ حیران ہوں کہ سکول کو اس طرز اور سطح پر لانے کی جدوجہد کر رہا تھا۔اس میں کافی حد تک کامیاب بھی تھا۔معلوم نہیں، اس طرح کے پرنسپل، اساتذہ اور لوگ کہاں چلے گئے۔لالچ اور رزقِ حرام کے پیسے نے اتنی دھند پیدا کر دی ہے کہ اچھے لوگ اس میں گم ہو چکے ہیں۔ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے۔پرنسپل بچوں کے ناخن تک دیکھتے تھا کہ تراشے ہوئے ہیں کہ نہیں۔بریک میں تمام طالبعلموں کو قطار بنا کر میس لیجایا جاتا تھا۔وہاں دودھ پینا لازمی تھا۔ٹیچر سر پر کھڑے ہو کر تمام بچوں کو دودھ پلاتے تھے۔کسی بچے کی جرات نہیں تھی کہ گلاس آدھا چھوڑ دے۔اچھی طرح یاد ہے کہ سکول کی ماہانہ فیس پچیس روپے تھی۔ساٹھ کی دہائی کے پچیس روپے بہت وقعت رکھتے تھے۔اب تو نہ پیسے کی وقعت ہے اور نہ تعلیم کی۔ارب پتی لوگ بھی کم پیسے ہونے کا گلہ کرتے ہیں۔غریب کے پاس سوائے گلے شکوؤں کے کچھ ہے ہی نہیں۔لہذا انکی کیا بات کرنی۔وہ تو مملکت خداداد میں جانور کی سطح کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ہر امیر آدمی اب کسی مغربی ملک کی شہریت لے چکا ہے۔انہیں اندازہ ہے کہ ملکی جہاز ڈوب رہا ہے۔

کلاس میں میرے ساتھ جو لڑکے تھے، وقت نے ثابت کیا کہ وہ بہترین تھے اور ہیں۔اپنے ہم جماعت سب کو اچھے لگتے

ہیں۔مگر غیر جذباتی طریقے سے بات کروں تو بھی، اپنا کہا ہوا جملہ صائب لگتا ہے۔ارشد میرا کلاس فیلو تھا۔جونیئر سکول سے سینئر سیکشن کا سفر اکٹھے طے کیا تھا۔ارشد کے والد زرعی یونیورسٹی میں ڈاکٹر تھے۔لائل پور میں گنتی کے ڈاکٹر ہونگے۔شائد دس بارہ یا اس سے بھی کم۔ڈاکٹر شفیع یعنی ارشد کے والد انتہائی سادہ طبیعت کے مالک تھے۔یاد ہے کہ کلینک جاتے ہوئے سوٹ پہنتے تھے۔مگر واپس آ کر بہت عام سا گھریلو لباس۔آج کل لوگوں کو اندازہ نہیں رہا کہ سادگی بذات خود کتنی بڑی نعمت ہے۔اس زمانے میں ڈاکٹر صاحب کے پاس نئے ماڈل کی گاڑی تھی۔پورے شہر میں معدودے چند گاڑیاں تھیں۔اس وقت کے سرمایہ دار بھی تانگوں پر یا پیدل سفر کرتے تھے۔ان محنتی سرمایہ داروں نے لائل پور کو پاکستان کا مانچسٹر بنا دیا تھا۔ظلم تو اب یہ ہے کہ موجودہ فیصل آباد میں کپڑے کے اکثر کارخانے بند پڑے ہیں۔مزدور بے کاری کے جہنم میں جھونک دیے گئے ہیں۔ایک مصنوعی ترقی کے ڈھول پیٹے جا رہیے ہیں۔مگر اب یہ ڈھول بھی پھٹ چکا ہے۔شعبدہ بازی کی بھی آخر کوئی حد ہوتی ہے۔جلتی ہوئی آگ کو کتنی دیر تک ٹھنڈا سایہ ثابت کیا جا سکتا ہے۔اب تو گھمبیر معاشی معاملات ہر خاص و عام کو معلوم ہو چکے ہیں۔ڈھول کی آواز بھی اب مدھم ہو چکی ہے۔سردیوں میں سکول کی یونیفارم میں کوٹ بھی شامل ہوتا تھا۔تمام طالبعلم نیلے رنگ کا موٹا گرم کپڑے کا کوٹ پہنتے تھے۔پورے اسکول میں یہی دستور تھا۔ایک دن ارشد کلاس میں آیا تو اعلیٰ سرج کا ڈبل بریسٹ کوٹ پہن رکھا تھا۔کوٹ اس درجہ دیدہ زیب تھا کہ تمام کی آنکھیں اس پر لگی ہوئی تھیں۔مجھے دوسرے طالبعلموں کا تو پتہ نہیں۔مگر میں نے پوری زندگی کسی بچے کو اتنا بڑھیا کوٹ پہنے نہیں دیکھا تھا۔سنہرے بٹن اور عمدہ سلا ہوا تھا۔خیر ارشد عملی مزاج میں اپنے لباس سے بہت شاندار انسان ہے۔مخلص اور دوستوں پر جان چھڑکنے والا انسان۔دوستوں کے غموں کا مداوا کرنے والا بشر۔انکی خوشیوں میں خوش رہنے والا اچھا شخص۔پرانے دوست ایک ایسے خزانے کی مانند ہوتے ہیں، جو وقت کے ساتھ ساتھ مزید قیمتی ہوتا جاتا ہے۔شائد انمول۔

ایک اور "مردِ نایاب" ذہن میں بار بار آ رہا ہے۔خیر جس وقت سکول میں تھا تو قطعاً اندازہ نہیں تھا کہ بڑا ہو کر کتنا اعلیٰ انسان بن جائیگا۔خالد نواز باجوہ ،کمالیے سے تعلق رکھتا تھا اور ہوسٹل میں رہتا تھا۔اس وقت ذہن میں اور کوئی بھی کلاس فیلو نہیں جو ہاسٹل میں رہتا ہو۔جب میں کیڈٹ کالج حسن ابدال گیا تو باجوہ اس وقت بھی ہاسٹل میں ہی تھا۔باجوہ کبھی کبھی کھل کر شرارتیں کرتا تھا۔کسی کو نقصان پہنچائے بغیر زندگی کو بھرپور طریقے سے بسر کرنا جانتا تھا۔یاد ہے کہ میرے چچا راؤ اسلم صاحب نے ایک موٹر سائیکل خریدی تھی۔تعجب کی بات یہ کہ خود موٹر سائیکل بالکل نہیں چلاتے تھے۔اعلیٰ سواری فدوی کے زیر استعمال رہتی تھی۔باجوہ نے موٹر سائیکل چلانا اسی پر سیکھی تھی۔سیکھنے کا مرحلہ زیادہ طویل نہیں تھا مگر زبردست ضرور تھا۔باجوہ موٹر سائیکل اور گھڑ سواری کے ملے جلے انداز میں ذاتی تربیت کے مراحل بڑے آرام سے طے کرتا گیا۔باجوہ ایک ایسا سلیم الفطرت انسان ہے کہ کبھی اپنے ذاتی کام کیلئے کسی کو کچھ نہیں کہتا۔ہمیشہ دوسروں کی مشکلات حل کرنے کیلئے مصروف کار رہتا ہے۔بے لوث اور مخلص انسان۔میں میڈیکل کالج میں تھا کہ ایک دن باجوہ، سرخ رنگ کی سپورٹس گاڑی لیکر ہوسٹل آیا۔1981-82 میں لاہور میں اتنی خوبصورت سپورٹس کار نایاب تھی۔قیمتی گاڑی باجوہ کو اسکے دادا نے لیکر دی تھی۔گاڑی کو دیکھنے کیلئے سارا ہوسٹل اکٹھا ہو گیا۔کیونکہ ایسی گاڑی اس زمانے میں لوگوں نے صرف فلموں میں دیکھی تھی۔بہر حال باجوہ

ایک آسودہ زندگی گزار رہا ہے۔خالد احمد خان کھرل مرحوم کے ساتھ اسکا دیرینہ تعلق تھا۔خالد کھرل کے انتقال کے بعد باجوہ کافی اداس سا ہو گیا ہے۔شائد بہت حد تک تنہا بھی۔وجہ یہ بھی ہے کہ باجوہ اور کھرل صاحب کا دفتر ایک ہی تھا۔دونوں کم از کم چھ سات گھنٹے ایک ہی دفتر میں بیٹھتے تھے۔خالد کھرل، آخری دم تک منظّم زندگی گزارتے رہے۔انکے بیٹے حیدر کو بخوبی اندازہ ہے کہ کھرل صاحب وقت کے کس درجہ پابند تھے۔اچھی زندگی گزار کر ملک عدم کی طرف روانہ ہوئے۔خالد باجوہ کا ذکر ہو رہا تھا۔باجوہ کاشتکاری کر رہا ہے اور خوب کر رہا ہے۔خدا اسے خوش وخرم رکھے۔دوستوں کیلئے تو ایک سرمایے کی حیثیت رکھتا ہے۔

ڈاکٹر ثاقب رزاق کا خصوصی ذکر کرونگا۔ثاقب امریکہ میں دہائیوں سے مقیم ہے اور ہسپتال میں کام کر رہا ہے۔چھ سات مہینے پہلے لاہور آیا تو بڑے عرصے بعد ملاقات ہوئی۔کمرے میں داخل ہوا تو اسے پہچان ہی نہیں پایا۔لمبی اور سفید داڑھی۔ایسے لگتا تھا کہ کوئی دینی عالم مدرسے سے نکل کر سیدھا میرے دفتر آ گیا ہے۔مگر وہ ایک دینی عالم نہیں ہے۔میری نظر میں ایک بزرگ ہے۔اپنے عمل سے ملک کا نام روشن کرنے والا انسان۔علم ہے کہ میری کئی لکھی ہوئی باتوں سے ناراض ہو سکتا ہے۔مگر یقین ہے کہ اسے منا لونگا۔ثاقب، امریکہ میں حیرت انگیز کام کرتا ہے۔غریبوں کا مفت علاج۔دوائیاں بھی اپنی تنخواہ سے خرید کر تقسیم کرتا ہے۔بتانے لگا کہ امریکہ میں بھی بہت غربت ہے۔جسکے پاس انشورنس نہیں، وہ علاج کروانے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔وجہ صرف یہ کہ علاج انتہائی مہنگا ہے۔ثاقب کے پاس اگر کوئی مریض پنی مالی عسرت کا ذکر کر دے، تو کوئی فیس نہیں لیتا۔ہسپتال کی انتظامیہ سے بھی فیس ختم کروا دیتا ہے۔دوائیاں بازار سے خرید کر ان لوگوں کو تقسیم کرتا ہے۔اپنے گھر سے کھانا پکوا کر مریضوں میں تقسیم کرتا ہے۔مالی وسائل کا بیشتر حصہ اسی طرح کے سماجی کاموں میں صَرف ہوتا ہے۔ہسپتال میں تمام عملہ اور ڈاکٹر، ثاقب کی جس درجہ عزت کرتے ہیں، یہ حقیقت میں بیان سے باہر ہے۔انسان دوست اور تعصب کے بغیر بڑا انسان۔کرسمس پر اپنی داڑھی کا بھرپور فائدہ اُٹھا کر "سینٹا کلاز "بن جاتا ہے اور بچوں میں تحفے تقسیم کرتا رہتا ہے۔آج تک کوئی پاکستانی نہیں دیکھا جو اس بلند سطح پر امریکہ میں لوگوں کی فلاح کیلئے مصروف ہے۔بتاتا نہیں مگر میں اسکی نیکیوں سے بے حد مرعوب ہوں۔اپنی ماں کی جس قدر خدمت ڈاکٹر ثاقب نے کی، بہت کم لوگ اس درجے کی خدمت کا حوصلہ رکھتے ہیں۔ثاقب بہر حال ایک گھنا درخت ہے جسکے سائے سے سفید پوش لوگ بھرپور فائدہ اُٹھا رہے ہیں۔پر صرف ثاقب ہی کیوں، ارشد، باجوہ اور میرے دیرینہ دوست تمام ہی ایسے ہیں۔1964 میں جیل روڈ پر لگے ہوئے گھنے درخت اور احباب اب میرے جسم اور ذہن میں منتقل ہو چکے ہیں۔سایہ دار اور شاداب دیرینہ دوست۔خوش قسمتی اور کیا ہوتی ہے۔

راؤ منظر حیات